جلد ۸۳ ماہ ذی قعدہ ۱۳۷۸ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۹ء نمبر ۵

مضامین

مقالات

آتش سے ایک بہاری ادیب کی ملاقات

از

جناب پروفیسر سید حسن صنا پٹنہ

راقم السطور کو کچھ دن قبل ایک نئی فارسی قلمی کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کا نام سوانح لکھنؤ ہے، اس کے مصنف نجات حسین خاں عظیم آبادی ہیں، سوانح لکھنؤ کا یہ نسخہ اصل کتاب کی نقل ہے، اس کا کاتب کم سواد اور بہت بے پروا معلوم ہوتا ہے، استنساخ کرنے میں اس نے جا بجا حروف و الفاظ حذف کر دیے ہیں، کہیں املا غلط لکھا ہے، بعض مقامات ایسے ہیں جہاں الفاظ کی صحیح قرأت دشوار ہے، اس مخطوطہ کی تاریخ کتابت ۲ شعبان المعظم ۱۲۶۴ھ (۸ اساڑھ ۱۲۵۵ فصلی) ہے۔[1]

نجات حسین خاں صاحب عظیم آباد کے ایک ممتاز خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، جس کے افراد کی بود و باش دولی گھاٹ (پٹنہ سیٹی) اور حسین آباد (شیخ پورہ ضلع مونگیر) دونوں مقامات میں تھی، یہ خاندان امارت و ثروت ہی میں نہیں بلکہ علم و دانش میں بھی معروف تھا، اور شعر و سخن کی شمع تو یہاں پشتہا پشت تک روشن رہی، نجات حسین خانصاحب کے پردادا حاجی احمد علی خاں قیامت، نواب امین الدولہ علی ابراہیم خاں بہادر نصیر جنگ، مولف

---

[1] مخطوطہ کے خاتمے میں پانزدہم اساڑھ ۱۲۵۵ فصلی مطابق ۲ شعبان اور روز شنبہ درج ہے، عمدہ سالہ جنتری دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۲ شعبان ۱۲۶۴ھ (۴ جولائی ۱۸۴۸ء) کو سہ شنبہ تھا اور اس روز فصلی تاریخ ۱۸ اساڑھ تھی۔

گلزار ابراہیم وصحف ابراہیم وغیرہ کے بھائی[1] اور فارسی کے شاعر تھے، نجات حسین خاں صاحب کے دادا، خادم حسین خاں خادم اور باپ محمد حسن خاں رشکی، فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ان دونوں بزرگوں کے اردو کلام کے نمونے تذکرۂ عشقی میں موجود ہیں[2]۔

نجات حسین خاں صاحب نے شاعری کا شوق خاندانی ترکہ میں پایا تھا، اشکی تخلص کرتے تھے۔

نجات حسین خاں اشکی کی ولادت ۱۲۳۳ھ میں ہوئی تھی، والد بزرگوار کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا، لہذا اپنے پھوپھا محمد یحییٰ خاں صاحب کے دامن عاطفت میں پرورش پائی، شاعری کے علاوہ فن شہسواری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، اور فن سلوتری میں ماہر تھے، ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ (= ۲۸ اکتوبر ۱۸۸۱ء) کو انتقال کیا اور تلسی منڈی گلزار باغ (پٹنہ سٹی) میں دفن ہوئے، ان کی تصانیف میں ایک فرس نامہ (گھوڑوں کے علم کے متعلق) ایک تذکرہ بنام تذکرۃ الابرار (جو ہنوز نایاب ہے) اور ایک روزنامچہ ہیں، روزنامچہ ہی کا نام سوانح لکھنؤ ہے،

نجات حسین خاں صاحب نے ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں جہلم دیکھنے کی غرض سے لکھنؤ کا سفر اختیار کیا، راستے میں جو واقعات پیش آئے اور لکھنؤ میں جو کچھ دیکھا اور سنا سب کا حال تاریخ وار اپنے روزنامچے میں تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے، اس کے مطالعہ سے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل کے لکھنؤ کے تمام معاشرتی، تمدنی اور ادبی حالات کا ایک واضح نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے، سیاحت کے علاوہ وہ ایک ازلی جذبہ کیساتھ لکھنؤ گئے تھے، وہاں جاکر انھوں نے تعزیہ اور علم کے جلوسوں اور مرثیہ و ہرسیہ کی مجلسوں میں شرکت کی، بازاروں کو گھوم پھر کر دیکھا، میر ضمیر، میر انیس اور مرزا دبیر کو مجلسوں میں اپنا بنا

---

[1] تذکرہ عشقی ورق ۳۱ ب (اودری یہ غم زاد) [2] ایضاً ورق ۳۱ الف وب اور ورق ۳۴ الف

کلام پڑھتے سنا اور لکھنؤ کے دیگر نامور شعرا، خواجہ حیدر علی آتش، مرزا مہدی قبول، مرزا محمد رضا برق، اور دستور سے ملاقاتیں کیں. مصنف نے اپنے تمام تجربوں اور ملاقاتوں کا حال اس روزنامچے میں نہایت صاف گوئی، بے تکلفی اور ذرا بے باکی سے بیان کیا ہے، یہ روزنامچہ دراصل ایک پرائیوٹ ڈائری ہے جس میں بعض ایسی باتیں درج کی گئی ہیں جو عام پڑھنے والوں کے لیے نہیں ہیں، مصنف نے انھیں محض یادداشت کے طور پر قلمبند کر لیا تھا،

لکھنؤ کے شاعروں سے نجات حسین خاں صاحب کی ملاقاتوں کا حال کسی اور موقع پر بیان کیا جائے گا، زیر نظر مضمون میں صرف اس ملاقات کا حال لکھا جاتا ہے جو انھوں نے آتش سے کی تھی،

نجات حسین خاں صاحب ۲۳ محرم ۱۲۵۹ھ (۲۴ فروری ۱۸۴۳ء) کو اپنے سفر پر روانہ ہوئے تھے، آرہ، بکسر، بنارس، الہ آباد اور کانپور ہوتے ہوئے تاریخ ۱۸ صفر کو لکھنؤ پہنچے، وہاں سرائے آغا میر میں مقیم ہوئے، تاریخ ۲۳ صفر (۲۵ مارچ) کو اپنے رفیقوں کے ساتھ "افضل شعرائے ریختہ گویاں، اکمل فصحائے طلاق اللسان، درۃ التاج شعرو سخن، سرآمد شعرائے زمن، خواجہ حیدر علی آتش" کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت چار گھڑی دن چڑھا تھا، یعنی تقریباً ۱۰ بجے دن کا وقت ہوگا، خواجہ صاحب نے کمال مہربانی اور غایت اخلاق کے ساتھ ان کا استقبال کیا، آتش کے حلیہ، سن اور لباس وغیرہ کے بارہ میں لکھتے ہیں،

"چہرہ نورانی باریش سفید، قامت کشیدہ دارد، سن شریف قریب ہفتاد، طبع مصفایش از قید ہوا و حرص آزاد، با وضع سادہ و طبع درویشانہ. بارچہ کرہ (کرتہ؟) در بر، فرش حصیر بر در گستردہ، نشستہ بودند"

خواجہ آتش نے نجات حسین خاں صاحب سے لکھنؤ آنے کی غرض پوچھی اور جب

موخرالذکر نے بتایا کہ ان کا مقصد ارباب کمال کی زیارت ہے، تو دیر تک عظیم آباد کے حالات دریافت کرتے رہے،

نجات حسین خاں صاحب لکھتے ہیں کہ "آتش جوانی میں شجاعت پیشہ تھے، سپاہانہ وضع رکھتے تھے اور رسالہ داروں کے افسر تھے، ان دنوں شعر و سخن سے ان کو اس قدر دلچسپی نہ تھی، لیکن جب انھوں نے سپاہی کا پیشہ ترک کیا اور درویشی اختیار کی تو تھوڑی ہی سی توجہ میں فن شعر میں ناموری کا جھنڈا بلند کر دیا اور ان کی شہرت اکناف عالم میں پھیل گئی، اگرچہ بظاہر انھوں نے اس فن میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی، مشاعروں میں خراج تحسین داد آفریں حاصل کرنے لگے، اوائل ایام میں خواجہ صاحب کی طبیعت میں متانت بہت زیادہ تھی، استغنا کی وجہ سے خاص و عام کسی کی طلب پر گھر سے باہر نہیں جاتے تھے، ان کی شہرت سنکر نواب معتمد الدولہ عرف آغا میر نے ان کو کئی بار طلب کیا مگر انھوں نے جانے سے انکار کر دیا، نواب صاحب کو اس انکار سے بہت رنج پہنچا، انھوں نے اپنے ایک نئے مکان میں ایک مشاعرہ منعقد کیا اور جب صحبت کا آغاز ہوا تو عین اسی وقت آتش کو مصرعہ طرح بھیجکر طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ فوراً غزل کہہ کر شریک صحبت ہوں، دوسری طرف حاضرین اور شعراء کو فہمایش کی کہ کوئی بھی آتش کے کلام کی تعریف میں لب وا نہ کرے، آتش کو جب صورت حال کی خبر ہوئی اور اپنی توہین کا سامان پایا تو تقاضائے وقت سمجھ کر ایک غزل لکھ ڈالی جس کا مطلع نئے مکان کی صفت میں تھا، اور شریک مجلس ہوئے، جب خواجہ صاحب کے پڑھنے کی باری آئی تو نواب صاحب سے مخاطب ہوکر یہ مطلع پڑھا

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے　　　زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے

نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، اور بے اختیار داد دینے لگے، حاضرین میں

بھی نعرۂ تحسین و شورِ آفریں بلند ہوا، اس دن کے بعد سے خواجہ صاحب نے انجمن آرائی یک قلم ترک کردی اور عزلت اختیار کرلی، چنانچہ فردوس منزل محمد علی شاہ نے اپنے عہد سلطنت میں انھیں ہر چند طلب کیا، لیکن عذر و بہانہ کرکے حاضر نہ ہوئے۔ اس کے باوجود حضرت بادشاہ نے از روئے قدردانی دو روپیہ روز خواجہ صاحب کے مصارف کے لیے مقرر کردیا، جو ابتک جاری ہے"

جب شعر و سخن کا ذکر چھڑا تو نجابت حسین خاں صاحب نے آتش سے استدعا کی کہ اپنا کلام سنائیں، ان کی درخواست پر آتش نے اس قصیدے کے چند اشعار سنائے جو انھوں نے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی شان اقدس میں لکھا تھا، اس کے بعد وہ قصیدہ سنایا جو حضرت امجد علی شاہ بادشاہ کی مدح میں نظم کیا تھا، اس کے علاوہ آتش نے اپنے شاگرد میر دوست علی خلیل کے قصیدے کے بھی چند اشعار سنائے۔ بعد ازاں اپنی چند "آبدار" غزلوں کو زبان مبارک سے ارشاد فرمایا ان غزلوں میں سے ایک غزل یہ تھی:-

باغباں انصاف پر بلبل سے آیا چاہیے — پہنچی اس کو زرِ گل کی پہنایا چاہیے

فرشِ گل بلبل کی نیت سے بچھایا چاہیے — شمع پروانوں کی خاطر سے جلایا چاہیے

پان بھی کھاؤ جمائی ہے جو مسی کی دھڑی — شام تو دیکھی شفق کو بھی دکھایا چاہیے

آئینہ میں خطِ نورس کا نظارا کیجیے — آہوانِ چشم کو ریحاں چرایا چاہیے

بوسہ اس لب کا ہی قوت بخش روحِ ناتواں — ایسی یاقوتی میسر ہو تو کھایا چاہیے

عشق میں حدِ ادب سے آگے رکھتا ہے قدم — شاخِ گلبن پر سے بلبل کو اڑایا چاہیے

دیکھیے کرتا ہے کیوں کر یار سے گستاخیاں — شوق کے بھی حوصلے کو آزمایا چاہیے

ہو گیا ہے ایک مدت سے دل نالاں خموش
باغ میں چل کر اسے بلبل سنایا چاہیے

حال دل کچھ کہا میں نے تو بولا سن کے یار
بس عبارت ہو چکی مطلب پہ آیا چاہیے

رنگ زرد و چشم تر کو کیجیے دعوئ عشق
دو گواہ حال اس قصہ کے لایا چاہیے

رام ہوتے ہی نہیں وحشی مزاجی ہے سوے
ان سیہ چشموں کو چو پہرہ لگایا چاہیے

خاطر آتش سے کہیے چند جز شعر اور بھی
بے نشاں کا نام باقی چھوڑ جایا چاہیے

غزل مذکور کے کل بارہ اشعار نسخہ میں نقل ہوئے ہیں، مروجہ دیوان میں ۱۶ اشعار ہیں، اور یہ غزل دیوان دوم میں شامل ہے، کیا عجب کہ اس زمانے میں تازہ کہی گئی ہو، آتش نے بقرینۂ غالب اپنا تازہ ہی کلام سنایا ہوگا، باقی چار اشعار بعد میں اضافہ کیے گئے ہوں،

اس ملاقات میں خواجہ آتش نے چار اور غزلیں، جن کے مطلعے ذیل میں درج ہیں، نجات حسین خاں صاحب کو سنائیں، روزنامچے میں ان غزلوں کے منتخب اشعار نقل کیے گئے ہیں، جس کا مقصد تفریح خاطر احباب ہے:

(۱) بیت ہیں دو ابروے زیبائے یار — مصرعہ برجستہ ہے بالائے یار (۱۴، اشعار)

(۲) پڑ گئی آنکھ جو ان کے چاند سے رخساروں پر — لوٹتے کبک نظر آگئے انگاروں پر (۵، اشعار)

(۳) خورشید حشر ہے ہے سینے کا داغ روشن — اندھیر ہے جو کہے اسکو چراغ روشن (۳، اشعار)

(۴) موسم گل ہے جنوں ہے شور ڈشتر پر اندنوں — جن چڑھا رہتا ہے دیوانوں کے سر پر اندنوں (۷، اشعار)

یہ چاروں غزلیں بھی دیوان دوم میں شامل ہیں،

نجات حسین خاں صاحب دیر تک خواجہ صاحب کی خدمت میں رہے، انھوں نے خواجہ صاحب سے 'دیوان جدید' نقل کرنے کے لیے مانگا، خواجہ صاحب نے بنہایت خوشی و کمال کرم، دینے کا وعدہ کیا اور یاد دہانی کا کام نواب مرزا کے سپرد ہوا، جن کی وساطت سے

نجات حسین خاں صاحب آتش کی خدمت میں پہنچے تھے۔ دوپہر کے قریب نجات حسین خانصاحب اپنی قیام گاہ کو لوٹ آئے، نالہ پھوہالی سے جہاں خواجہ صاحب کی سکونت تھی، اپنی سرائے تک پیادہ پا ہی آئے۔

آٹھ دن کے بعد یعنی ۲ ربیع الاول (۳ اپریل) کو سنیچر کے روز نجات حسین خاں صاحب دوسری دفعہ خواجہ آتش کی ملاقات کو گئے، سہ پہر کا وقت تھا۔ خواجہ صاحب کے سامنے شاہجہان آباد کے چھپے ہوئے کسی اخبار کے دو لفافے رکھے ہوئے تھے، پہلے کچھ دیر تک خبروں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ بعد ازاں شعر و سخن کا چرچا ہوا، اس دفعہ بھی خواجہ صاحب نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع یہ ہے:

دل کو فزوں چمن کی مٹی سے سرد پایا گیندے سے میں نے اپنے چہرے کو زرد پایا

اس غزل کے آٹھ شعر نقل کیے گئے ہیں، یہ غزل بھی دیوان دوم میں شامل ہے۔

دوسری ملاقات میں آتش نے اپنے دیوان کے سات اجزا، مع قصیدہ و غزلوں کے دینے کا از سر نو وعدہ کیا اور اس وعدہ کو مستحکم کیا، قریب شام نجات حسین خاں صاحب وہاں سے رخصت ہوئے۔

پانچ روز کے بعد یعنی ۷ ربیع الاول کو خواجہ آتش نے حسب وعدہ اپنا دیوان مرزا صاحب کے معرفت نجات حسین خاں صاحب کو بھیج دیا، نجات حسین خاں صاحب نے اس کا ایک جز نقل کرنے کے لیے کاتب کے حوالہ کیا۔

نجات حسین خاں صاحب کی محولۂ بالا یادداشتوں سے خواجہ آتش کے حالات اور کلام کے متعلق بعض اہم اور دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں، ان کے بیانات کی روشنی میں آتش کے احوال و آثار پر از سر نو نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات خواجہ صاحب کی عمر کے بارے میں ہے "آب حیات" اور "آب بقا" میں آتش کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں، لیکن مقدم الذکر میں سن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا موخر الذکر میں البتہ خواجہ محمد بشیر کے قول کے حوالہ سے بتایا گیا ہے، وفات کے وقت (یعنی ۱۲۶۳ھ میں) خواجہ آتش کا سن اسّی بیاسی کے قریب تھا[1] نجات حسین خاں صاحب ۱۲۵۹ھ میں کہتے ہیں کہ آتش کی عمر تقریباً ستر سال تھی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس کا بیان زیادہ صحیح ہے، "ریاض الفصحا" میں مصحفی تحریر کرتے ہیں کہ "حالا کہ سن عمرش بہ بست و نہ سالگی رسیدہ"[2] ریاض الفصحا، ۱۲۲۱ھ سے لیکر ۱۲۳۶ھ تک کے عرصہ میں لکھی گئی ہے، اگرچہ یہ معلوم نہیں کر اس ۱۵ برس کی مدت میں آتش کا ترجمہ کب سپرد قلم ہوا، بقرینۂ غالب آغاز تالیف یعنی ۱۲۲۱ھ میں یا اس کے کچھ ہی بعد مصحفی نے آتش کا حال لکھا ہوگا، اس حساب سے آتش کا سال ولادت ۱۱۹۲ھ ہوتا ہے، اور ۱۲۵۹ھ میں ان کی عمر ۶۷ سال ہوتی ہے، لہذا نجات حسین خاں صاحب کا بیان "سن شریف ہفتاد" صحیح ہے، اس کے چار سال بعد خواجہ آتش کا انتقال ہوگیا اور سنہ وفات میں کسی شبہہ کی گنجایش نہیں، "آب بقا" کا بیان غلط ہے، کیونکہ موت کے وقت خواجہ آتش کی عمر بیش از بیش ۱۷ (اکہتر) سال ہوتی ہے، دس بارہ سال کا فرق، تین چار سال کے فرق سے یقیناً اس قدر زیادہ ہے کہ سن کا اندازہ لگانے میں غلطی نہیں ہونی چاہیے، اگر خواجہ آتش کا سال ولادت ۱۱۹۲ھ سے قبل فرض کیا جائے تو ۱۲۲۱ھ میں ان کی عمر ۲۹ سال سے زیادہ ہو جاتی ہے، مصحفی نے سن کے بارہ میں قطعی بات کہی ہے، "قریب" کا لفظ لگا کر تخمین کی کوئی گنجایش نہیں رکھی، اور اگر ہم یہ فرض کریں کہ مصحفی نے آتش کا ترجمہ ۱۲۲۱ھ کے بعد لکھا ہے تو خواجہ صاحب کی عمر وفات کے وقت اور کم ہو جاتی ہے،

---

[1] تذکرہ آب بقا ص ۱۶، [2] ریاض الفصحا، (انجمن ترقی اردو) ترجمہ آتش،

دوسری بہت اہم بات جو نجات حسین خاں صاحب نے لکھی ہے یہ ہے کہ "آتش نے بظاہر کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی"۔ حالانکہ اب تک یہ بات مسلم سمجھی جاتی ہے کہ آتش کو مصحفی سے تلمذ تھا، خود مصحفی نے ریاض الفصحا میں آتش کی شاگردی کی شہادت دی ہے، نجات حسین خاں صاحب کے قول کی آخر بنیاد کیا ہے، اس معاملے میں مصحفی کے بیان کو پرکھنے کی ضرورت ہے، وہ تحریر کرتے ہیں:

"موی الیہ (آتش) از ابتدائے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دو میکرد، اما میلان طبعش بر طرف فارسی بیشتر بود، و آں روزہا کلام منظوم خود را بنظر فقیر می گذرانید و براقت طبعش از اں جلوہ ظہور می داد[۱]"

یعنی آتش آغاز شعر گوئی سے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے، لیکن ان کی طبیعت کا میلان زیادہ تر فارسی کی طرف تھا، ان دنوں اپنے کلام منظوم پر مصحفی سے اصلاح لیتے تھے، عبارت سے ظاہر ہے کہ مصحفی کچھ عرصہ پہلے کی بابت کہہ رہے ہیں زمانہ افعال اور فقرہ 'آں روزہا' دونوں اسی بات کی گواہی دیتے ہیں، مصحفی کی تحریر کا مطلب یہ ہے کہ ۱۲۲۱ھ یعنی ۲۹ برس کی عمر سے قبل غالباً پانچ چھ سال پیشتر، آتش اپنے کلام پر جس کا زیادہ تر حصہ شعر فارسی پر مشتمل تھا، مصحفی سے اصلاح لیتے تھے، لہذا یہ بات صاف ہے کہ جہاں تک فارسی شعر گوئی کا تعلق ہے، آتش نے مصحفی کی اصلاح سے اکتساب فیض تو کیا ہے، لیکن اردو شاعری میں ان سے تلمذ برائے نام ہی ہے، نجات حسین صاحب کا قول بالکل درست ہے، بعض تذکرے جو آتش کے زمانۂ حیات میں لکھے گئے ہیں، اس معاملے میں خاموش ہیں، ذکا نے عیار الشعراء[۲] میں آتش کی فارسی گوئی کا ذکر کیا ہے لیکن

---

[۱] ریاض الفصحاص ۳ [۲] عیار الشعرا (قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ) ورق ۲۶ الف

شاگردی کی بابت کچھ نہیں لکھا، 'بہار بے خزاں' میں بھی کوئی ذکر نہیں، حالانکہ مولف احمد حسین سحر نے دونوں شاعروں کی خوب تعریفیں کی ہیں، اسی طرح 'گلشن بیخار' میں (سنہ تالیف ۱۲۴۸ھ سے ۱۲۵۰ھ تک) آتش کا حال اگرچہ اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن مصحفی کا ترجمہ قدرے طویل تر ہے، اور اس میں یہ تحریر ہے کہ "اکثر سخنوران آں بلدان اکتساب فن از و کردہ اند" لیکن نہ آتش کا نام اس سلسلے میں آیا ہے اور نہ کسی اور شاگرد کا، اگر آتش کی شاگردی کی اہمیت ہوتی تو یہ نظر انداز کرنے کے قابل بات نہ تھی، "عمدۂ منتخبہ" مولفہ میر محمد خاں سرور میں جس کا سال تکمیل ۱۲۲۲ھ ہے، یہ عزور مرقوم ہے "آتش تخلص، اسمش خواجہ حیدر علی ساکن بلدۂ لکھنؤ، شاگرد رشید مصحفی ہمدانی، در شعر گوئی اکثر مضامین نازک از طبعش می تراود" لیکن جیسا کہ سرور کی عبارت سے ظاہر ہے، اس زمانے میں آتش کے اردو کلام کی زیادہ اہمیت نہ تھی، چنانچہ تذکرہ میں بھی بطور نمونہ آتش کے صرف آٹھ دس ہی شعر نقل ہوئے ہیں۔

نجات حسین خاں صاحب کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آتش کو محمد علی شاہ بادشاہ کی جانب سے دو روپیہ یومیہ یعنی ساٹھ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی، رقم تنخواہ کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے کسی نے پچاس روپیہ اور کسی نے اسّی روپیہ ماہوار لکھا ہے، نجات حسین خاں صاحب کے بیان کی روشنی میں یہ اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔

ایک اہم بات جو روزنامچہ میں مرقوم ہے اور جو ادبی انکشاف کا درجہ رکھتی ہے، یہ ہے کہ آتش نے قصیدے بھی لکھے تھے، کم از کم دو قصیدے تو ان کے قلم سے ضرور ہی نکلے تھے، ایک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں اور دوسرا امجد علی شاہ بادشاہ کی مدح میں، پہلے قصیدے کے چند اشعار اور دوسرا قصیدہ غالباً پورا، آتش نے خود اپنی زبان سے نجات حسین خاں صاحب کو سنائے تھے، کسی تذکرہ نگار نے آتش کے قصیدوں کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اب تک اس ضمن میں جو کچھ

لے: عمدۂ منتخبہ، قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری، لندن۔

لکھا گیا ہو (یہ کہ آتش نے کسی امیر یا رئیس کی شان میں کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا) نجات حسین خانصاحب کے بیان سے اس قضیہ کی تکذیب ہو جاتی ہو، لیکن یہ امر تعجب خیز ہو کہ آتش کے دیوان میں قصیدے کیوں شامل نہیں، حالانکہ جس دیوان جدید کے سات اجزاء روزنامچہ نگار کو آتش نے برائے نقل بھیجے تھے، اس میں غزلوں کیساتھ قصیدے بھی شامل تھے، آتش کا دیوان مع دیوان دوم (جسکو نجات حسین خاں صاحب دیوان جدید بتاتے ہیں) آتش کی زندگی میں مطبع محمدی میں سنہ ۱۲۶۰ھ میں یعنی نجات حسین خانصاحب کی ملاقات کے ایک برس بعد طبع ہوا تھا معلوم نہیں کس مصلحت سے آتش نے قصیدوں کو اس سے خارج کر دیا، دیوان کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۲۶۸ھ میں آتش کی موت کے پانچ برس بعد مطبع علی بخش میں چھپا، اس میں شاعر کی چوبیس فاضل غزلیں تلاش کر کے اضافہ کی گئیں لیکن اس ایڈیشن میں بھی کوئی قصیدہ موجود نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہو کہ آتش نے ان قصیدوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈالدیا، افسوس، نہ روزنامچہ میں قصیدوں کے اشعار نقل کیے گئے ہیں، اور نہ وہ نسخہ ہی اب دستیاب ہوتا ہو جو نجات حسین خانصاحب نے اپنے لیے نقل کرایا تھا، ورنہ آتش کی قصیدہ نگاری کا بھی اندازہ ہوتا جس طرح انکا فارسی کلام اب نایاب ہو، اسی طرح انکے قصیدے بھی معدوم ہیں،

نجات حسین خانصاحب کے روزنامچے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ جس زمانے میں انھوں نے آتش سے ملاقات کی، شاعر کی سکونت "نالہ جھوائی" میں تھی، "تذکرہ نادر" مولفہ مرزا کلب حسین خاں بہادر کے سوا اور کسی تذکرے میں یہ مقام مذکور نہیں ہے، "تذکرہ نادر" میں بھی "مالی" کی جگہ پر "انگریز" لکھا ہے۔[۱]

آتش نے جتنی غزلیں نجات حسین خانصاحب کو سنائیں، وہ سب کی سب دیوان دوم میں شامل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہو کہ دیوان دوم کی ترتیب کا کام مکمل ہو چکا تھا اور کیا عجب کہ مطبع میں چھپنے کو جا چکا ہو، کیونکہ دیوان آتش کی پہلی اشاعت سنہ ۱۲۶۰ھ میں مکمل ہوئی ہے۔

---

[۱] تذکرہ نادر مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ص ۱۰